درس ۱۶

جہاد فی سبیل اللہ کی غایتِ اولیٰ شہادت علی النّاس

سورۃ الحج کے آخری رکوع کی روشنی میں

© rasailojaraid.com

"طالب و مطلوب" کی نسبت کے حوالے سے فلسفہ دین کی اہم بحث

حقیقتِ جہاد سے متعلق بعض بنیادی باتوں کی وضاحت پچھلے سبق میں ہو چکی ہے۔ اب ہمیں مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے چوتھے حصے کے پہلے باقاعدہ درس کا آغاز کرنا ہے جو سورۃ الحج کے آخری رکوع پر مشتمل ہے۔ اگرچہ ہمارے اس منتخب نصاب کے اس مرحلے پر جو مضمون زیر بحث ہے اس سے اصلاً اس رکوع کی صرف آخری آیت ہی متعلق ہے، لیکن یہ پورا رکوع، جو چھ آیات پر مشتمل ہے، قرآن مجید کے انتہائی جامع مقامات میں سے ہے۔ اور اس مرحلے پر کوشش یہ ہو گی کہ اختصار کے ساتھ اس پورے رکوع کے مفہوم کو کسی درجے میں بیان کر دیا جائے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ ہمارے اس منتخب نصاب میں اب تک جتنے مضامین آئے ہیں ان کا ایک مختلف انداز اور اسلوب میں اجمالی اعادہ ہو جائے گا۔

© rasailojaraid.com

دو تمہیدی باتیں

اس سے پہلے کہ اس رکوع کی آیات کا مطالعہ کیا جائے' دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ ان کا مستحضر رکھنا قرآن حکیم سے ایک ذہنی مناسبت پیدا کرنے کے لئے بہت مفید ہو گا۔ ایک بات تو اجمالاً پہلے بھی عرض کی جاچکی ہے کہ قرآن مجید کی اکثر سورتوں کی ابتدائی اور اختتامی آیات نہایت جامع ہوتی ہیں۔ یہ ویسے بھی ایک عام قاعدہ ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ کسی غزل کا مطلع اور مقطع خصوصی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ قصیدے کا ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی خطبے کا اگر آغاز ایسا ہو کہ خطیب اپنے سامعین کی توجّہ کو جذب کرے اور اختتام ایسا ہو کہ وہ اپنے سامعین پر کوئی دائمی تاثر چھوڑ جائے تو وہ خطبہ کامیاب ہو گا۔ قرآن مجید اصلاً خطبے کے اسلوب پر نازل ہوا ہے اور اس کی اکثر سورتوں کی حیثیت خطبوں کی سی ہے۔ چنانچہ ان کے آغاز میں آنے والی آیات اور جن آیات پر ان سورتوں کا اختتام ہوتا ہے' بالعموم بہت جامع' بہت مؤثر اور توجّہ کو جذب کر لینے والی ہوتی ہیں۔ اس سے پہلے ہم سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی چند آیات پڑھ چکے ہیں۔ ان آیات کے حوالے سے بھی یہ حقیقت سامنے آئی تھی' لیکن سورۃ الحج کے اس آخری رکوع کے حوالے سے یہ حقیقت مزید مبرہن ہو جائے گی۔

اس رکوع کی چھ آیات میں جامعیت کا جو عالم ہے اس کا اندازہ آپ اس سے کیجئے کہ پہلی چار آیات میں خطاب "یٰاَیُّھَا النَّاسُ " (اے لوگو!) سے ہے۔ اور ان میں گویا کہ قرآن مجید کی وہ دعوتِ عام ہے جو وہ ہر فردِ نوعِ بشر کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان آیات میں ان اصولوں کا خلاصہ آگیا ہے جن کو ماننے کی وہ دعوت دیتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ وہی اصولِ ثلاثہ ہیں : (۱) توحید (۲) معاد (۳) رسالت۔ اسلام کا پورا قصر انہی تین بنیادوں پر استوار ہوا ہے۔ لہٰذا پہلی چار آیات میں "یٰاَیُّھَا النَّاسُ " سے خطاب کا آغاز کر کے ان تینوں باتوں کا ایک ایسا جامع ملخّص پیش کر دیا گیا ہے کہ واقعتاً قرآن مجید کے اعجاز کے سامنے گردنیں جھک جاتی ہیں۔

اس کے بعد کی دو آیات میں خطاب ہے "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے الفاظ سے۔ یعنی

© rasailojaraid.com

اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے' جنہوں نے ان باتوں کو مان لیا۔ اب اگلی دعوت جو ہے وہ دعوتِ عمل ہے۔ گویا کہ پہلی چار آیات میں دعوتِ ایمان دی گئی اور اب ماننے والوں پر جو فرائض اور ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور ان کے جو تقاضے ہیں انہیں بیان کر دیا گیا۔ اور بڑی منطقی بات ہے کہ جنہوں نے مانا ہی نہیں اُن سے کسی عمل کا مطالبہ نہیں ہے۔ ان کے سامنے کسی عملی تقاضے کا پیش کیا جانا بے معنی ہے۔ جنہوں نے خدا کو' یا رسول کو' یا آخرت کو نہیں مانا' اب ان سے کیا کہا جائے کہ نماز پڑھو یا دین کے لئے محنت اور جدّ و جُہد کرو۔ یہ سارے تقاضے دعوتِ عمل کے ہیں۔ یہاں ان کو دو آیات میں سمو لیا گیا۔ اس پہلو سے جب آپ اس پر مزید غور فرمائیں گے تو یہ حقیقت مزید واضح ہو کر سامنے آئے گی کہ یہ مقام اس اعتبار سے قرآن مجید کا جامع ترین مقام ہے۔

دوسرے یہ کہ اگرچہ یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا اصل معجزہ قرآن مجید ہے' اور "وجوہِ اعجاز القرآن" پر بھی بہت بڑی بڑی محنتیں ہوئی ہیں' اس موضوع پر بڑی ضخیم تصانیف موجود ہیں' اور میرے نزدیک اعجازِ قرآن کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وجوہ اعجازِ قرآن کا احاطہ بھی ناممکن ہے۔ یعنی یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا احاطہ کیا جائے کہ قرآن کن کن اعتبارات سے معجزہ ہے۔ لیکن یہاں ایک خاص پہلو کی طرف توجّہ دلانی مقصود ہے۔ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو آج سے چودہ سو برس قبل نازل ہوئی۔ اس کے اوّلین مخاطب ایک خاص قوم کے افراد اور ایک خاص معاشرہ میں بسنے والے لوگ تھے۔ ان کے کچھ نظریات و عقائد تھے' کچھ مذہبی رسوم تھیں' اپنے خاص حالات اور معاملات تھے۔ قرآن حکیم کی گفتگو کے پس منظر میں حالات کے اس تانے بانے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگر قرآن ان سے صرف اصولی باتیں کہتا اور بڑے منطقیانہ اور فلسفیانہ انداز میں اونچی اونچی عقلی باتیں ان کے سامنے رکھتا تو شاید وہ انہیں اپنے سے اتنی زیادہ متعلق معلوم نہ ہوتیں۔ قرآن جس پس منظر میں اور جن ظروف و احوال میں نازل ہوا ہے اس کا عکس قرآن کے اسلوب میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ بالکل ایسے محسوس ہوتا ہے کہ قرآن انہی سے مخاطب ہے' ساری بات انہی سے ہو رہی ہے۔ اسی ماحول environment میں اپنی گفتگو اور تمام دلائل کے لئے بنیاد فراہم کی جا رہی

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

ہے‘ لیکن دوسری طرف یہی کتاب ایک ابدی ہدایت نامہ ہے۔ چنانچہ بڑے سے بڑے فلسفی‘ بڑے سے بڑے سائنس دان اور بڑے سے بڑے حکیم و دانا انسان کی علمی تشفی‘ اس کی علمی پیاس کی سیری اور اس کی عقل اور ذہن و فکر کی رہنمائی تا قیامِ قیامت اسی کتاب کو کرنی ہے۔

اب آپ غور کیجئے کہ یہ کس قدر کٹھن مسئلہ ہے۔ چودہ سو برس پہلے کے زمانے میں نازل ہونے والی ایک کتاب جو ایک طرف ایک اَن پڑھ قوم کو اپنے مخاطبینِ اوّل کی حیثیت سے اس طرح خطاب کرتی ہے کہ وہ قوم بھی یہ محسوس نہ کرے کہ اس کی کوئی بات ہمارے سروں کے اوپر ہی سے گزرتی چلی جارہی ہے اور ہم سے متعلق نہیں ہے‘ دوسری طرف چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی کے کسی نابغہ فرد کو‘ کسی علامہ اقبال کو اس طرح possess کرتی ہے کہ وہ پکار اٹھتا ہے کہ مجھے اگر کہیں کوئی تشفی میسر آئی ہے‘ میری علمی پیاس کے لئے اگر کہیں کوئی تسکین کا سامان میسر آیا ہے تو صرف قرآن مجید میں! یہ قرآن کا عظیم اعجاز ہے کہ وہ بات کرتا ہے تو اِس انداز میں کہ جو قوم اس کی اوّلین مخاطب تھی گویا اسی سے بات ہو رہی ہے‘ لیکن اسی کے بین السطور میں اس طرح کی چیزیں موجود ہیں جو بڑے سے بڑے فلسفی اور بڑے سے بڑے فہیم و دانا انسان کی عقلی اور فکری رہنمائی کے لئے اپنے اندر پورا سامان لئے ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے اس رکوع کے بعض پہلوؤں کی طرف بعد میں توجہ دلائی جائے گی۔

نوعِ انسانی کے لئے ایمان کی دعوت

اس تمہید کے بعد اب آیئے کہ پہلے اس کی ابتدائی چار آیات‘ جن کے بارے میں عرض کیا جاچکا ہے کہ وہ دعوتِ ایمان پر مشتمل ہیں‘ غور کریں۔ فرمایا :

﴿ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ○ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ○ اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ ۝ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا خَلۡفَہُمۡ ؕ وَاِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ۝﴾ (الحج : ۷۳-۷۶)

ان آیاتِ مبارکہ کا ایک رواں ترجمہ یہ ہو گا :

"اے لوگو' ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے توجّہ سے سنو! یقیناً وہ ہستیاں کہ جنہیں تم پکارتے ہو اللہ کے سوا اس پر قادر نہیں ہیں کہ کسی مکھی تک کو تخلیق کر سکیں' خواہ وہ اس کے لئے مل جل کر کوشش کریں۔ اور اگر کوئی مکھی ان سے کچھ چھین لے جائے تو وہ تو اس سے اس کو واپس لینے پر بھی قادر نہیں۔ کتنا ضعیف' کتنا لاچار ہے وہ جو طالب ہے' جو چاہ رہا ہے' اور کتنا کمزور اور بے بس ہے وہ جسے چاہا جا رہا ہے' جو مطلوب ہے۔ انہوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسے کہ اس کی قدر کا حق تھا۔ یقیناً اللہ قوی ہے' زبردست ہے۔ اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی۔ اللہ تعالیٰ سننے والا' دیکھنے والا ہے۔ جانتا ہے جو کچھ کہ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ کہ ان کے پیچھے ہے' اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹا دیئے جائیں گے۔"

یہ ہیں وہ چار آیات جن میں سے پہلی دو آیات میں توحید اور اس کے مقابل کی گمراہی یعنی شرک کا بیان ہے۔ احقاقِ توحید اور ابطالِ شرک کے بعد ایک آیت میں نبوّت و رسالت سے متعلق ایک نہایت اہم بحث وارد ہوئی ہے۔ اور آخری آیت معاد سے متعلق ہے' یعنی جزا و سزائے آخرت۔

اب یہاں دیکھئے کہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو بُت پرست ہیں' اصنام پرستی ان کا دین و مذہب ہے' پتھر کی مورتیوں کے سامنے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں' سجدے کر رہے ہیں' گڑگڑا گڑگڑا کر ان سے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ان کو مخاطب کر کے کہا گیا : ﴿ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ ﴾ "اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے"۔ یہ وہی لفظ ہے جو ذرا سی تبدیلی کے ساتھ ہمارے ہاں "ضرب المثل" کے نام سے مستعمل ہے۔ ﴿ فَاسۡتَمِعُوۡا لَہٗ ﴾ تو اسے توجہ سے سنو۔ "سَمِعَ یَسۡمَعُ" کے معنی ہوتے ہیں سننا اور "اِسۡتَمَعَ یَسۡتَمِعُ" کے معنی ہوں گے توجّہ سے سننا' کان لگا کر سننا' دھیان سے سننا۔ چنانچہ یہی لفظ آیا ہے سورۃ الاعراف کی اس آیت میں : ﴿ وَ اِذَا قُرِئَ الۡقُرۡاٰنُ فَاسۡتَمِعُوۡا لَہٗ وَ اَنۡصِتُوۡا ﴾ یعنی جب

© rasailojaraid.com

قرآن پڑھا جارہا ہو تو پوری توجہ اور دھیان کے ساتھ اسے سنو اور خاموش رہو۔ تو یہاں فرمایا: ذرا توجہ سے سنو' ایک مثال بیان کی جاتی ہے اُس عمل کی جو تم کررہے ہو۔ ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ﴾ "بے شک یہ جنہیں تم پکار رہے ہو اللہ کو چھوڑ کر"۔ جن سے دعائیں کررہے ہو' جن کے سامنے نذریں پیش کررہے ہو' جن کے لئے چڑھاوے چڑھارہے ہو۔ ﴿لَنۡ یَّخۡلُقُوۡا ذُبَابًا وَّلَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَہٗ﴾ "یہ اس پر بھی قادر نہیں ہیں کہ ایک مکھی تک کی تخلیق کرسکیں' اگرچہ یہ سب جمع ہو جائیں"۔ ﴿وَاِنۡ یَّسۡلُبۡہُمُ الذُّبَابُ شَیۡئًا لَّا یَسۡتَنۡقِذُوۡہُ مِنۡہُ﴾ "اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کرلے جائے تو یہ وہ چیز اُس سے چھڑا نہیں سکتے"۔ یعنی تخلیق تو کیا کریں گے' اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کرلے جائے تو یہ اس سے چھڑانے پر قادر نہیں ہیں۔ ان حلووں مانڈوں پر اور ان چڑھاووں پر جو تم ان کے سامنے رکھتے ہیں' اگر مکھیاں بھنبھنانے لگیں تو یہ ان کو اڑانے پر بھی قادر نہیں ہیں۔ ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالۡمَطۡلُوۡبُ﴾ "کمزور ہے چاہنے والا اور جسے چاہا جاتا ہے"۔ یعنی کیا ہی ضعیف ولاچار اور بے بس ہے وہ جسے چاہا جارہا ہے' جو مطلوب ہے۔ اور اسی سے اندازہ کرو کہ کتنا لاچار اور بے بس ہے وہ جو اسے چاہ رہا ہے' جو ایسے مطلوب کا طالب بنا ہے۔

معبودانِ باطل کی بے بسی

اب پہلے ذرا اس پر توجہ کیجئے کہ اس مثال سے اگرچہ بظاہر ایک خیال پیدا ہوتا ہے کہ جتنے اہتمام کے ساتھ بات شروع کی گئی تھی کوئی ویسی بڑی بات تو سامنے نہیں آئی' یہ تو آنکھوں کے سامنے کی بات تھی' وہ بھی جانتے تھے کہ یہ بُت جو ہیں یہ ہاتھ نہیں ہلا سکتے' یہ بُت مکھیوں کو اڑانے پر بھی قادر نہیں ہیں' پھر ادھر توجہ دلانا چہ معنی دارد؟ واقعہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے اصنام پرستی یا بُت پرستی کو ایک فلسفہ بنا کر پیش کیا ہے' ان کے نظریات کا معاملہ کچھ اور ہے' لیکن عوام الناس میں جو بات ذہن میں بیٹھ جاتی ہے وہ یہی ہے کہ یہی ہیں ہمارے معبود' یہی ہیں ہماری دعاؤں کے سننے والے اور یہی ہیں ہماری مشکل کشائی اور حاجت روائی پر قادر۔ یہ مثال عوام کے اس خیال کو توڑنے کے لئے دی گئی ہے۔

© rasailojaraid.c

اسی غرض کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک عملی تدبیر اختیار کی تھی کہ بت کدے میں گھس کر تمام بتوں کو توڑ پھوڑ ڈالا اور ایک بڑے بت کے کاندھے پر وہ تیشہ لٹکا دیا کہ جس سے ان تمام چھوٹے بُتوں کو توڑا تھا۔ جب لوگوں کو خبر ہوئی تو ایک زلزلہ آگیا' ایک طوفان برپا ہوگیا کہ کس نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا؟ اور جب یہ کہا گیا کہ ہاں' ایک سرپھرا نوجوان ہے' ابراہیم' وہ ان کی توہین کیا کرتا ہے' ان کے بارے میں کچھ ایسی ویسی باتیں کرتا رہتا ہے تو انہیں پکڑ کر لایا گیا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا یہ تم نے کیا ہے؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اس سے پوچھو جس کے کاندھے پر تیشہ موجود ہے' اس نے کیا ہوگا۔ واقعاتی شہادت (circumstantial evidence) تو اسی کے خلاف جاتی تھی۔ جب انہوں نے کہا کہ تم جانتے ہو وہ نہ بول سکتے ہیں' نہ حرکت کر سکتے ہیں۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہ چوٹ لگائی: ﴿ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ "تف ہے تم پر اور ان پر کہ جنہیں تم پوجتے ہو"۔ جن کے بارے میں تمہیں معلوم ہے کہ ہاتھ نہیں ہلا سکتے' کچھ سنتے نہیں' کچھ بولتے نہیں' انہیں پوج رہے ہو! اس پر ان لوگوں کی نگاہوں کے سامنے سے ایک دم پردہ ساہٹ گیا۔ قرآن مجید ان کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچ رہا ہے: ﴿ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ﴾ انہوں نے اپنے گریبانوں میں جھانکا۔ یہ حقیقت ایک لحظہ کے لئے ان کے سامنے منکشف ہوئی کہ سچ بات وہی ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے کہی' ہم ہی مغالطے میں ہیں' ہم کسی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں' لیکن پھر انہوں نے اپنی اُس قومی حمیت' اُس عصبیت جاہلیہ کو مجتمع کیا اور اپنی پوری قوتوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلاف بروئے کار لے آئے۔ یہاں بھی اسی طرح کا انداز اختیار کیا گیا ہے کہ ذرا سوچو' غور کرو' یہ ہاتھ ہلانے پر قادر نہیں' یہ سب مل جل کر بھی چاہیں تو ایک مکھی تک تخلیق نہیں کر سکتے۔ ان کو پوج رہے ہو' ان سے مرادیں مانگ رہے ہو' ان کے سامنے گڑگڑا رہے ہو؟

فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست

یہ تو ہوا اس شرک کا ابطال جو اُس وقت اس معاشرے میں بالفعل موجود تھا۔ اب جو ٹکڑا آیا ہے ﴿ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴾ واقعہ یہ ہے کہ یہ حکمتِ قرآنی کا ایک

© rasailojaraid.c

بہت بڑا خزانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تین الفاظ کی ترکیب سے قرآن مجید نے نوعِ انسانی کے لئے ایک بہت بڑی بنیادی رہنمائی فراہم کر دی ہے۔ غور کیجئے کہ وہ ہدایت و رہنمائی کیا ہے۔ اس سلسلے میں چند باتیں نمبروار اپنے ذہن میں رکھنا مفید رہے گا۔

سب سے پہلی بات یہ کہ درحقیقت انسان کہلانے کا مستحق وہی انسان ہے جس کا کوئی نہ کوئی ہدف، کوئی نہ کوئی نصب العین، کوئی نہ کوئی آدرش، کوئی نہ کوئی آئیڈیل ہے۔ اگر انسان بغیر کسی مقصد اور نصب العین کے زندگی بسر کر رہا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ وہ انسان نما حیوان ہے اور حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ حیوان کا کوئی مقصدِ زندگی نہیں۔ زندگی برائے زندگی کا نظریہ انسان کے لئے نہیں، یہ صورت بالفعل حیوانات کے لئے ہے۔ وہ اپنے حیوانی داعیات کے تحت زندہ ہیں۔ انسان ان سے مقصد بر آری کرتا ہے، انہیں اپنے کام میں لاتا ہے، لیکن ان کا اپنا کوئی مقصدِ حیات نہیں۔ انسانوں میں سے بھی جو اس سطح پر زندگی بسر کر رہے ہوں وہ قرآن مجید کے الفاظ میں: ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ "وہ چوپایوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے"۔ انسان وہی قرار پائے گا جس کا کوئی مقصد اور نصب العین معین ہو، جس کے لئے وہ محنت اور جدّوجُہد کر رہا ہو۔

دوسری بات یہ کہ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ اگر مقصد اور نصب العین اعلیٰ ہے تو اس کے لئے جدّوجُہد کر کے انسان خود بھی ایک بلند تر اور اعلیٰ تر شخصیت کی تعمیر کر سکے گا۔ کسی رفیع الشان اور بلند نصب العین کے لئے جدّوجہد کر کے اسے خود بھی ترفّع حاصل ہو گا۔ لیکن اگر مقصد پست ہے، آئیڈیل پست ہے تو انسان خود بھی پستی کا مکین رہے گا۔ اس کی اپنی شخصیت بھی پستی ہی کی جانب مائل رہے گی۔ اس کی اپنی سیرت و کردار کی کسی اعلیٰ سطح پر تعمیر ممکن نہ ہو گی۔ یہ بالکل اس طرح ہے کہ جیسے کسی اونچی فصیل پر چڑھنے کے لئے آپ کو ایک کمند دے دی جائے تو آپ کو پہلے وہ کمند پھینکنا ہو گی۔ اس کمند کے پھینکنے کا دارومدار آپ کی قوّتِ بازو پر ہے۔ آپ اسے جتنا اونچا پھینک سکیں گے اتنا ہی اونچا پھر آپ چڑھ بھی سکیں گے۔ اگرچہ پھر بھی چڑھنا آپ کو اپنی محنت سے ہو گا، لیکن اس کمند کو اونچا پھینک کر آپ نے اونچا چڑھنے کا امکان پیدا کر لیا۔ اور اگر کمند ہی کہیں نیچے

© rasailojaraid.com

اٹک کر رہ گئی تو ظاہر ہے کہ آپ اگر اس پر چڑھیں گے بھی تو صرف اتنی ہی بلندی تک پہنچ سکیں گے جہاں تک کہ وہ کمند جا سکی۔ چنانچہ اگر آپ کا آدرش ' آپ کا نصب العین ارفع و بلند ہے تو آپ خود بھی رفعت اور بلندی تک رسائی حاصل کر سکیں گے اور اگر آدرش اور نصب العین ہی پست ہے تو اس سے ایک پست شخصیت اور پست سیرت و کردار ہی وجود میں آئے گا۔

فرض کیجئے کہ ایک شخص نے صرف اپنی ذات ہی کو اپنا مقصود بنا لیا ہے ' بقول جگر مراد آبادی ؎ "اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں!" وہ اپنے ہی حریمِ ذات کے گرد چکر لگا رہا ہے تو یہ شخص انتہائی خود غرض اور کٹھور دل ہو گا۔ اس شخص کے اندر سے تمام محاسنِ اخلاق نکلتے چلے جائیں گے۔ اس سے بلند تر نصب العین ہو گا اُس شخص کا جو اپنی قوم کو یا اپنے وطن کو اپنا آئیڈیل بنائے ' اس کے لئے محنتیں کرے ' اس کے لئے جدوجہد کرے۔ ظاہر بات ہے کہ اس نسبتاً بلند تر نصب العین کے لئے جدّوجہد کرنے والا شخص خود بھی نسبتاً ایک بہتر شخصیت کا مالک ہو گا۔ اس میں اپنی قوم کے لئے ایثار اور قربانی کا مادہ ہو گا۔ وہ اپنی قوم کو اپنی ذات سے مقدّم رکھے گا۔ اس کے سینے میں ایک وسعت ہو گی اور اس کی سوچ کے اندر بھی ایک وسعت پیدا ہو جائے گی۔ یہ ایک بلند تر شخصیت ہے جو اس پہلے نصب العین یعنی صرف اپنی ذات یا شخص پرستی یا خود پرستی کے مقابلے میں قوم پرستی یا وطن پرستی کے نصب العین سے وجود میں آئے گی۔ اس سے بلند تر نصب العین انسان دوستی کا نصب العین ہے۔ یعنی قوم و وطن کے امتیاز کے بغیر انسان کی خدمت ' انسان سے محبّت۔ یہ یقیناً پہلے دو سے اعلیٰ تر اور بلند تر نصب العین ہے۔ اس کی بنا پر ایک اعلیٰ تر اور عمدہ تر شخصیت وجود میں آئے گی۔

یزداں بکمند آور.....

لیکن تمام آدرشوں ' تمام نصب العینوں اور تمام آئیڈیلز میں بلند ترین نصب العین اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہے۔ اس کو علامہ اقبال کہتے ہیں ؎ "منزلِ ما کبریاست" میری منزل مقصود اللہ کی ذات سے کم کہیں نہیں ہے۔ اسی کو علامہ نے تشبیہہ کے انداز میں

© rasailojaraid.c

وہی لفظ کمند استعمال کر کے یوں کہا ہے ع "یزداں بکمند آور اے ہمّتِ مردانہ!" انسان کے نصب العین اور ہدف ہونے کا مقام و مرتبہ سوائے خدا کے اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔ وہی انسان کا مقصود ہو، وہی مطلوب ہو، وہی محبوب ہو۔ اب یہ بلند ترین نصب العین، بلند ترین آئیڈیل، بلند ترین آدرش اختیار کرنے کے نتیجے میں ایک اعلیٰ ترین شخصیت وجود میں آئے گی۔ جس کا آدرش خدا پرستی ہو، جس کا نصب العین رضائے الٰہی ہو، جس کا مطلوب و محبوب خود اللہ ہو اس کی اپنی شخصیت بتمام و کمال کیا ہو گی۔ اس کے لئے آپ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا نقشہ ذہن میں لایئے۔ اس نصب العین سے سینہ اتنا کشادہ ہو جاتا ہے کہ اللہ کی کُل مخلوق کے لئے جس کے اندر وسعت اور گنجائش ہو، صرف انسان بلکہ حیوانات تک کے لئے شفقت و محبّت ہو۔ رَحْمَةً لِلعَالَمِین ہونے کی کیفیت در حقیقت اُس شخص ہی کو حاصل ہو سکتی ہے جو صحیح معنی میں خدا کا پرستار ہو، جس نے خدا کی بندگی کا حق ادا کر دیا ہو، خدا ہی اس کا مطلوب و محبوب ہو گیا ہو۔ وہ الفاظ یاد کیجئے کہ جو آنحضور ﷺ کی زبانِ مبارک پر اس دنیا سے رحلت کے وقت بار بار آئے : "اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيقِ الْاَعْلٰى" یعنی بس ایک اللہ ہی مطلوب و مقصود ہے اور اب اُسی کی طرف مراجعت کے لئے طبیعت بے چین ہے۔ مطلوب کمزور اور ضعیف ہے تو طالب بھی کمزور اور ضعیف ہو گا۔ مطلوب کا مقام و مرتبہ اعلیٰ اور بلند ہو تو اس کے طالب کو بھی ترفع حاصل ہوتا چلا جائے گا۔

شرک : اللہ کی قدر کے فقدان کا نتیجہ

فرمایا : ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ "انہوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسے کہ اس کی قدر کا حق تھا"۔ ایک عجیب نقشہ کھینچا گیا ہے کہ انسان کی یہ کمند ان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں الجھ کر کیوں رہ جاتی ہے۔ اس لئے کہ انسان خدا کے جمال و جلال کا کوئی اندازہ نہ کر پایا جیسا کہ اُسے کرنا چاہئے تھا۔ اگر وہ اللہ کے حسن و جمال کی کوئی جھلک دیکھ پاتا، اس کے مرتبہ کمال کا کہیں کسی انداز میں عُشرِ عشیر ہی کوئی تصوّر کر پاتا تو یہ دنیا و مافیہا اس کی نگاہوں میں ہیچ ہو گئی ہوتی۔ وہ نہ صرف یہ کہ ان میں سے کسی کو اپنا مقصود اور آئیڈیل نہ بناتا بلکہ

© rasailojaraid.com

واقعتاً اس کا مطلوب حقیقی، اس کا مقصودِ اصلی صرف ذاتِ باری تعالیٰ بن جاتی۔ یہ اگر ہوا ہے تو اس لئے ہوا ہے کہ انسان کی نگاہیں دنیا میں الجھی ہوئی ہیں۔ علّامہ اقبال نے جو مکالمہ لکھا ہے عقاب اور چیونٹی کے درمیان اور اس میں عقاب سے یہ کہلوایا ہے کہ ؎

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں!
میں نُہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں!

اس کے مصداق انسان کی توجہات پستی کی طرف ہیں۔ انسان جو پستی کا مکین ہے اس نے اِن پست اشیاء ہی کو اپنا مطلوب و مقصود بنالیا ہے۔ اس لئے کہ وہ خدا کے جلال و جمال، اس کے کمال، اس کے حسن کا کوئی تصوّر نہ کر سکا۔ اس نے اللہ کی قدر نہ پہچانی جیسا کہ اس کا حق تھا۔ ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیۡزٌ﴾ اللہ بذاتہٖ قوی ہے، اللہ بذاتہٖ عزیز ہے۔ وہ القویّ ہے اور العزیز ہے۔ اصل میں اشارہ کیا جا رہا ہے کہ شرک جب بھی ہو گا وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے فقدان یا اس کی کمی کے باعث ہو گا۔ اگر اللہ کو پہچان لیا جائے جیسا کہ پہچاننے کا حق ہے تو شرک کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کون ہے جو گھٹیا کو اعلیٰ کے مقابلے میں قبول کرے گا۔ چونکہ وہ اعلیٰ اس کے سامنے آیا نہیں، اس کا وہ کوئی تصور کر نہیں پایا، اُس کی کوئی جھلک اُس نے دیکھی نہیں ہے، اس لئے وہ عاشق بنا پھرتا ہے اس ادنیٰ کا۔ اگر کہیں اُس اعلیٰ کی کوئی جھلک اُس نے دیکھ لی ہوتی تو یہ دنیا و مافیہا اس کے لئے ہیچ ہو جاتی۔

اب آپ ذرا اس کا تجزیہ کیجئے۔ جاہلیتِ قدیمہ کا شرک یہ تھا کہ خدا کے تصور اور خدا کی معرفت کی کمی کی وجہ سے انسان نے خدا کو اپنے ذہن کے پیمانوں سے ناپا۔ اس نے سمجھا کہ خدا ایک بڑا بادشاہ ہے، تو بادشاہ کیلئے بھی تو شہزادے شہزادیاں ہونے چاہئیں۔ بادشاہ کو بھی تو اولاد کی طلب ہوتی ہے کہ کوئی اس کا وارث ہو۔ لہٰذا اس کے لئے بیٹے یا بیٹیاں تجویز کر دیئے گئے۔ پھر یہ کہ بڑے سے بڑے بادشاہ کے بھی آخر کچھ اعیانِ مملکت اور نائبینِ سلطنت ہوتے ہیں، اس کی حکومت کا تخت انہی کے بل پر قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ کے لئے بھی انہوں نے کچھ نائبینِ سلطنت تجویز کر لئے اور ان کو بھی کچھ اختیارات دے دیئے گئے کہ یہ فلاں کا دیوتا ہے اور یہ فلاں کی دیوی ہے۔ یہ آگ کا دیوتا ہے، یہ پانی کا دیوتا ہے اور یہ دولت کی دیوی ہے۔ اس طور سے خدائی اختیارات کی تقسیم کر دی

© rasailojaraid.com

گئی۔ یا یہ کہ بڑے سے بڑے انسان اور بڑے سے بڑے بادشاہ کے بھی کچھ ایسے مقربینِ بارگاہ اور مصاحبینِ خاص ہوتے ہیں جن کی بات وہ ٹالا نہیں کرتا۔ لہٰذا اللہ کے بھی کچھ ایسے دوست ہیں کہ ان کی بات وہ نہیں ٹال سکتا۔ اگر وہ سفارش کر دیں تو بس بیڑا پار ہو جائے گا۔ یہ تصورات ہیں جو انسان نے خدا کو خود اپنے پیمانوں پر ناپ کر قائم کئے ہے

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندِ دِگر
رُست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر

وہ جو ایک مکالمہ علامہ اقبال نے ایک بُت تراش اور اس کے تراشے ہوئے بُت کے مابین پیش کیا ہے' اس میں بُت یہ کہتا ہے کہ تُو تو مجھے خدا بنانے چلا تھا اور بنایا کیا ہے؟ اپنے دو ہاتھ دیکھے تو میرے بھی دو ہاتھ بنا دیئے۔ تُو نے مجھے اپنی ہی صورت پر' اپنی ہی شکل پر ڈھال دیا ہے

مرا بر صورتِ خویش آفریدی!
برونِ خویش تن آخر چہ دیدی؟

تو نے اپنے سے باہر بھی کچھ دیکھا؟ تیرے سامنے تو اپنا ہی وجود ہے۔ تو خدا کو جب انسان اپنے پیمانوں پر اور اپنے وجود کے مطابق ڈھال کر دیکھتا ہے تو اس کے نتیجے میں شرک کا ایک انبار اور طومار وجود میں آجاتا ہے۔

اِس وقت کا شرک بھی درحقیقت خدا کی معرفت کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ خدا پرستی کی بجائے وطن پرستی' قوم پرستی' خود پرستی' مفاد پرستی ــــــ یہ ساری چیزیں کیوں ہیں؟ اس لئے کہ انسان اپنے خول سے باہر نکل کر اللہ کے حسن و جمال کا کوئی مشاہدہ نہ کر پایا۔ اگر کہیں انسان اس کی کوئی جھلک دیکھ پاتا تو یہ تمام چیزیں ہیچ ہو جاتیں اور ان میں سے کسی کو اس کے مطلوب و مقصود ہونے کی حیثیت حاصل نہ رہتی اور "منزلِ ما کبریاست" کے مصداق ذاتِ باری تعالیٰ ہی اس کا مطلوب و محبوب اور منتہائے مقصود ہوتی۔ اب اس کا علاج اگر کوئی ہے تو وہ یہی کہ اللہ کی معرفت کی روشنی کو عام کیا جائے' خدا کی پہچان لوگوں میں عام کی جائے۔ اگر انسان خدا کو پہچان لے اور اللہ کی قدر کسی درجے میں کر سکے جیسا کہ اس کی قدر کا حق ہے' اور اگر اس کی قوتوں' اس کی توانائیوں' اس کے اختیارات'

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

اس کے صفاتِ کمال اور اس کے حسن و جمال کا کوئی ہلکا سا اندازہ بھی کر پائے تو ممکن نہیں ہے کہ پھر وہ اس کے مقابلے میں کسی اور کی طرف متوجہ ہو اور کسی اور کو اپنے قلب کے سنگھاسن پر محبوب و مطلوب کا درجہ دے کر بٹھائے۔ تو یہ ہے شرک کا اصل سبب اور یہ ہے اس کے سدباب کی واحد کوشش۔ یہ ہے وہ توحید اور شرک کا فلسفہ کہ جو ان دو آیات میں انتہائی جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔

نبوّت و رسالت سے متعلق ایک اہم حقیقت کا بیان

سورۃ الحج کے آخری رکوع کے جزوِ اوّل کی تیسری آیت میں نبوت و رسالت سے متعلق ایک نہایت اہم حقیقت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ فرمایا : ﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ﴾ لفظ "اِصْطَفٰى" صفی سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں چُن لینا' پسند کرلینا' to choose ۔ اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ چن لیتا ہے' پسند فرما لیتا ہے۔ آگے چلیے! رُسل جمع ہے رسول کی۔ اور اَرْسَلَ۔ يُرْسِلُ۔ اِرْسَالًا کے معنی ہیں بھیجنا۔ تو رسول کے معنی ہوئے بھیجا ہوا' فرستادہ' پیغامبر' سفیر' ایلچی ـــــ پوری آیت کا ترجمہ یوں ہو گا "اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی!" یہ درحقیقت سلسلۂ رسالت یا سلسلۂ وحی کی دو کڑیاں ہیں کہ جن کو یہاں بہت واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

نبوّت و رسالت کی اصل غرض و غایت

ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ نبوت و رسالت یا وحی کی اصل غرض و غایت کیا ہے! یہی کہ نوعِ انسانی تک اللہ کا پیغامِ ہدایت پہنچ جائے۔ انسان روزِ قیامت یہ نہ کہہ سکے کہ اے اللہ! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تو چاہتا کیا ہے؟ تجھے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے؟ ان کی اس دلیل کو ختم کرنے اور اللہ کی طرف سے حجت قائم کرنے کے لئے رسول بھیجے گئے اور وحی و رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا گیا۔ اس ضمن میں یہ دو الفاظ اپنے ذہن میں ٹانک لیجیے : قطعِ عذر اور اتمامِ حجت۔ یہ ہے مقصد نبوت کا' رسالت کا' وحی کا اور انزالِ کتب کا۔ اس مضمون کے بیان میں سورۃ النساء کی یہ آیت بہت اہم ہے : ﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ

© rasailojaraid.com

وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلاَّ یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ﴾ ”رسولوں کو ہم نے بھیجا مبشّر اور نذیر بنا کر‘ تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی دلیل باقی نہ رہے“۔ ان کے پاس اپنی غلط روی کے لئے کوئی عذر نہ رہے۔ آپ غور کیجئے کہ ایک طرف اللہ کی ذات وراء الوراء ثم وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے اور اتنی لطیف ہے کہ لفظ ”لطیف“ بھی کسی درجے میں کثافت کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ ادھر انسان ہے پستیوں کا مکین‘ اسفل سافلین‘ ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ○ ﴾ ___ چنانچہ اللہ کا پیغام انسانوں تک پہنچانے کے لئے حکمتِ خداوندی نے یہ طریقہ تجویز فرمایا کہ درمیان میں دو کڑیاں (links) اختیار کی گئیں۔ پہلا لنک‘ پہلی کڑی ہے رسولِ مَلک‘ یعنی فرشتوں میں سے ایک ایلچی اور پیغامبر کا انتخاب عمل میں آیا۔ آپ جانتے ہیں کہ فرشتہ نورانی مخلوق ہے۔ اپنی اس نورانیت کی وجہ سے یہ مخلوقِ خدا سے منجملہ ایک قرب رکھتی ہے۔ فرشتہ کلام اللہ کی تلقی کرتا ہے اللہ سے۔ وہ پیغام حاصل کرتا ہے اللہ سے اور اسے جا پہنچاتا ہے انسانوں میں سے ایک منتخب مرد کو‘ ایک چُنے ہوئے فرد کو جو اخلاق اور سیرت و کردار کے اعتبار سے انسانیت کی معراج پر فائز ہوتا ہے۔ مخلوق ہونے کے اعتبار سے فرشتہ اور انسان دونوں ایک دوسرے سے قرب رکھتے ہیں اور اس بناء پر ان کے مابین ایک اتّصال ممکن ہے۔ چنانچہ رسولِ مَلک نے وہ پیغام اللہ سے حاصل کر کے رسولِ بشر تک پہنچایا اور اب رسولِ بشر کی یہ ذمہ داری ہوئی کہ وہ پہنچائے اس پیغام کو اپنے ابنائے نوع تک۔ اس کا پہنچانا قولاً بھی ہوگا اور عملاً بھی ہوگا۔ وہ زبان سے بھی اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائے گا‘ انہیں اس کے قبول کرنے کی دعوت دے گا اور عمل سے اِس کا ایک نمونہ بھی پیش کر کے حجت قائم کر دے گا کہ یہ دعوت اور یہ پیغام محض کوئی نظری یا خیالی (theoretical) شے نہیں ہے‘ یہ کوئی ناقابلِ عمل پیغام نہیں ہے‘ بلکہ اس کا ایک عملی نمونہ بھی موجود ہے۔ اسی لئے قرآن مجید اس نکتے پر خصوصی زور دیتا ہے کہ : ﴿ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾۔ انبیاء و رُسل کی پوری شخصیت نوعِ انسانی کے لئے ایک اسوہ اور نمونہ ہوتی ہے کہ اپنے تمام بشری تقاضوں کے باوصف وہ وحی الٰہی کی اس تعلیم پر عمل کر کے دکھادیں اور اس کا

© rasailojaraid.com

ایک عملی نمونہ پیش کر دیں' تاکہ لوگوں کے پاس اپنی بے عملی اور غلط روی کے لئے کوئی دلیل اور کوئی عذر باقی نہ رہے۔ یہ ہے نبوت و رسالت کی اصل غرض و غایت!

ایمان بالملائکہ کی خصوصی اہمیت

اس آیت کے حوالے سے یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ ایمان بالملائکہ کی اہمیت کیا ہے! ورنہ بظاہر تو اس بات پر ایک تعجب سا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ایمان بالملائکہ پر اس قدر زور کیوں دیا گیا ہے۔ آیہء بر میں' جو ہمارے اس منتخب نصاب کا دوسرا سبق تھا' ملائکہ پر ایمان کا ذکر موجود تھا: ﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ﴾ اسی طرح حدیث جبریل کو ذہن میں لائیے۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ "اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ" تو نبی اکرم ﷺ کی جانب سے جواب یہی دیا گیا کہ ((اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلَائِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ.....اِلَی الْاٰخِرِ)) معلوم ہوا کہ ایمان بالملائکہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اس کے بغیر وحی کی توجیہہ ممکن نہیں ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں بہت بڑی ٹھوکر کھائی ہے کچھ فلاسفہء قدیم نے اور انہی کے اتباع میں بہت سے دانشورانِ جدید نے بھی۔ اس دور میں سر سید احمد خاں کو اس طبقہء فکر کا سب سے بڑا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے جنہوں نے ملائکہ کے وجود کا صریح انکار کیا کہ ملائکہ کا کوئی صاحبِ تشخّص وجود نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وحی کی توجیہہ کیا ہے! بالآخر انہیں کہنا پڑا کہ وحی کا چشمہ تو قلبِ نبی ﷺ سے ہی پھوٹتا ہے۔ وحی کو نبی تک لانے والی خارج میں کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ وحی کو لانے والے خارجی عنصر کے اس انکارِ مطلق کا نتیجہ یہ ہوا کہ وحی کا مسئلہ ایک چیستان بن گیا۔ وحی کی اصل حقیقت پھر کیا ہے؟ سر سید احمد خاں نے ایک شعر میں اپنے اس گمراہ کن خیال کو بڑے شدّ و مد کے ساتھ پیش کیا ہے ؎

زجبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

اگرچہ مصرعِ ثانی میں معشوق کا لفظ دو معنی دے رہا ہے' یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ معشوق

© rasailojaraid.com

سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ معشوق سے ان کی مراد ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ بہرحال یوں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو انہوں نے بیک بینی و دوگوش اس معاملے سے نکال باہر کیا۔ قرآن مجید کا یہ مقام اس معاملے کی اہمیت کو واضح کر رہا ہے۔ اور جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔

ذہن میں رکھئے کہ یہ مضمون سورۃ التکویر میں بھی آیا ہے اور اس کا اعادہ سورۃ النجم میں بھی ہوا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اپنی اصل ملکی حالت میں دو بار دیکھا ہے۔ اِس ملاقات کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے کہ کسی روایت میں اگر راویوں کی کڑیاں متّصل نہ ہوں' ان کی ملاقات ثابت نہ ہو تو وہ روایت ناقابلِ اعتماد ہو جائے گی۔ قرآن بھی ایک روایت ہے۔ یہ اللہ کی حدیث ہے جو بروایت جبرئیل علیہ السلام پہنچی محمد ﷺ تک اور پھر نبی اکرم ﷺ نے اسے پہنچایا انسانوں تک۔ اس اہم اور نازک معاملے میں روایت کی ان کڑیوں کا اتّصال بہت اہمیت رکھتا ہے۔ سورۃ التکویر میں حضور ﷺ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کی ملاقات کا ذکر بڑے اہتمام سے ہوا ہے : ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ○ ﴾ کہ "حضور ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا تھا افقِ مبین پر! اسی طور سے سورۃ النجم میں دوسری ملاقات کا ذکر ہے : ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ○ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ○ ﴾ کہ حضرت جبرئیل کو اصل ملکی صورت میں آنحضور ﷺ نے دوسری بار شب معرج میں سدرۃ المنتہیٰ پر دیکھا تھا۔ قرآن مجید نے ان دونوں کی اس ملاقات کو دو مقامات پر اس قدر صراحت کے ساتھ اسی لئے بیان کیا ہے کہ یہ وحی کی دو کڑیاں ہیں۔ رسولِ ملک نے اللہ تعالیٰ سے اس پیغام کو حاصل کر کے پہنچایا رسولِ بشر تک اور رسول بشر نے اس کو پہنچا دیا خلقِ خدا تک۔ یہ گویا کہ ایمان بالرّسالت کی ایک اہم بحث تھی جو اس مقام پر ایک آیت میں آئی!

اب چوتھی آیت میں عقیدۂ معاد اور عقیدۂ آخرت کا بیان ہے : ﴿ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ﴾ "وہ (اللہ تعالیٰ) جانتا ہے جو کچھ کہ لوگوں کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے"۔ لیکن یہ جاننا کس لئے ہے؟ جواب بھی ساتھ ہی موجود ہے۔ ﴿ وَاِلَى اللّٰهِ

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ "بالآخر سارے معاملات اللہ کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے"۔ تمام معاملات آخری فیصلے کے لئے اس کی عدالت میں پیش ہوں گے۔ ہر شخص کو جواب دہی کے لئے وہاں حاضر ہونا ہو گا۔

یہاں ایک آیت میں بڑے اختصار کے ساتھ عقیدۂ آخرت کا گویا لُبِّ لباب اور خلاصہ سامنے لے آیا گیا ہے۔ اس اختصار کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۂ مبارکہ (سورۃ الحج) کے پہلے رکوع میں چونکہ انتہائی وضاحت کے ساتھ آخرت کا بیان ہوا ہے' لہٰذا یہاں آخری رکوع میں اس کی طرف ایک اجمالی اشارے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ چار آیات ہیں جن کا آغاز "یٰاَیُّھَا النَّاس" کے خطاب سے ہوا ہے۔ ان میں جو اہم مضامین آئے ہیں ان میں شرک کا ابطال' توحید کا اثبات' شرک کا اصل سبب ﴿ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ﴾ شرک کا انسان کی سیرت و کردار پر یہ اثر کہ پھر وہ ایک پست شخصیت کا مالک ہو کر رہ جاتا ہے اور توحید کا اصل حاصل کہ اللہ کے پجاری اور اللہ کے پرستار خود اپنی ذات میں بھی ترفّع حاصل کرتے ہیں' پھر نبوّت و رسالت کی اہم بحث میں سلسلۂ وحی کی دو کڑیوں رسولِ ملک اور رسولِ بشر کا ذکر اور اس کے بعد عقیدۂ آخرت کا بیان سب شامل ہیں۔

اہلِ ایمان سے دین کے تقاضے

اب اگلی آیت میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو ان حقائق کو مان چکے ہوں' ان پر ایمان لا چکے ہوں۔ چنانچہ آغاز ہو رہا ہے ﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کے الفاظ سے۔ "اے اہلِ ایمان!" یعنی اے وہ لوگو جنہوں نے مان لیا توحید کو' جنہوں نے تسلیم کر لیا آخرت کو' جو ایمان لے آئے رسالت پر' آؤ کہ تمہیں بتایا جائے کہ اب تمہیں کرنا کیا ہے! دین تم سے کن باتوں کا مطالبہ کرتا ہے' تمہاری دینی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ —— آپ دیکھیں گے اس مقام پر دو آیتوں میں دین کے عملی تقاضوں کو نہایت جامعیت اور اختصار کے ساتھ جمع کر دیا گیا۔ اور پے بہ پے فعل امر کا استعمال ہے کہ یہ کرو اور یہ کرو! یہ ہیں دین کے عملی تقاضے! فرمایا:

© rasailojaraid.com

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ ﴾

(الحج : ۷۷‘۷۸)

”اے اہل ایمان! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی پرستش کرو‘ اور نیک کام کرو‘ تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے۔ اُس نے تمہیں چن لیا ہے‘ اور تمہارے لئے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔ یہ تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ ہے۔ اُس نے تمہارا نام رکھا مسلمان‘ اس سے پہلے بھی اور اس میں بھی‘ تاکہ ہو جائیں رسولؐ گواہ تم پر اور ہو جاؤ تم گواہ پوری نوعِ انسانی پر۔ پس قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ اور اللہ سے چمٹ جاؤ! (اللہ کے دامن سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ!) وہ تمہارا حامی ہے‘ (مددگار ہے‘ پشت پناہ ہے۔) تو کیا ہی اچھا ہے وہ ساتھی اور مددگار اور کیا ہی اچھا ہے وہ پشت پناہ اور حمایتی!“

پہلا تقاضا : ارکانِ اسلام کی پابندی

ان دو آیات پر غور کیجئے۔ پہلی آیت میں چار اوامر وارد ہوئے اور ان میں ایک بڑی خوبصورت معنوی ترتیب نظر آتی ہے۔ اس حقیقت کو اختصار کے ساتھ سمجھنے کے لئے ایک ایسی سیڑھی کا نقشہ اپنے ذہن میں لایئے جس کے چار قدمچے (steps) ہوں۔ دیکھئے‘ کسی بھی مدّعیٔ ایمان سے دین کا پہلا تقاضا یہ ہو گا کہ وہ ارکانِ اسلام کی‘ شعائرِ دین کی اور فرائض کی پابندی کرے۔ ان میں اوّلین فریضہ‘ کہ جس کو اسلام اور کفر میں امتیاز قرار دیا گیا ہے ____ اَلْفَرْقُ بَيْنَ الْكُفْرِ وَالْاِسْلَامِ الصَّلٰوةُ ____ نماز ہے۔ یہ عِمَادُ الدِّيْنِ یعنی دین کا ستون ہے۔ ارکانِ اسلام میں سے رُکنِ رکین یہی نماز ہے۔ اس

© rasailojaraid.

آیت میں نماز کے دو ارکان یعنی رکوع اور سجود کے حوالے سے مراد درحقیقت نماز ہے اور یہ نماز گویا نمائندہ ہو گئی تمام ارکانِ اسلام کی۔ اس لئے کہ یہ ان میں سرفہرست ہے۔ لہٰذا مطالباتِ دینی کی پہلی سیڑھی مشتمل ہے ارکان اسلام کی پابندی پر۔

دوسرا تقاضا : عبادتِ ربّ

اب دوسری سیڑھی کی طرف قدم بڑھاؤ ﴿ وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ﴾ صرف نماز روزہ ہی مطلوب نہیں ہے' رب کی پرستش' اس کی بندگی اور اس کی اطاعتِ کُلی پوری زندگی میں درکار ہے۔ یہ اطاعت بلاچون وچرا ہونی چاہیئے اور بلا استثناء بھی! زندگی کو حصّوں اور اجزاء میں تقسیم نہ کر دیا گیا ہو کہ ایک حصے میں اس کی اطاعت کی جاتی ہو اور زندگی کے بعض گوشے اس اطاعت سے یکسر خالی ہوں۔ احکامِ خداوندی کی تفریق نہ ہو جائے کہ کوئی سر آنکھوں پر اور کوئی پاؤں تلے! وہ بندگی اور اطاعتِ کُلّی مطلوب ہے جو محبّتِ خداوندی کے جذبے سے سرشار ہو کر کی جائے۔ یہ دوسری سیڑھی ہے مطالباتِ دین کی۔ اور درحقیقت ارکانِ اسلام سے بھی مطلوب یہ ہے کہ ایک مسلمان کے اندر یہ صلاحیت واستعداد پیدا ہو جائے کہ وہ اپنی پوری زندگی کو اپنے رب کی اطاعت کے سانچے میں ڈھال سکے۔ نماز و روزہ اور زکوٰۃ و حج سب اسی لئے ہیں کہ انسان پوری زندگی بندگیٔ رب کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل بن سکے! یہ دوسرا تقاضا ہوا۔

تیسرا تقاضا : بھلائی کے کام اور خدمتِ خلق

اس سلسلے کی تیسری سیڑھی کا بیان اس آیہ مبارکہ میں ﴿ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ ﴾ کے الفاظ میں ہوا ہے کہ نیک کام کرو' بھلے کام کرو۔ یہاں ظاہر بات ہے کہ خدمتِ خلق کے کام مراد ہیں کہ انسان کا وجود اپنے ہم نوع افراد کے لئے' پوری نوعِ انسانی کے لئے سراپا خیر کا موجب اور سبب بن جائے۔ اس کے بھی دو درجے ذہن میں رکھئے' ایک درجہ وہ ہے جسے آپ خدمتِ خلق کا بنیادی تصوّر کہہ سکتے ہیں اور جس سے سب لوگ واقف ہیں' یعنی یہ کہ بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے' اگر کوئی لباس سے محروم ہے تو اسے کپڑے پہنائے جائیں' کوئی بیمار ہے تو اس کی دوا دارو کا اہتمام کر دیا جائے' کسی راہ چلتے کو راستہ بتا دیا

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

جائے۔ اسی طرح یتیموں‘ بیواؤں‘ مسکینوں اور محتاجوں کی خبر گیری اور سرپرستی کا شمار بھی خدمتِ خلق کے کاموں میں ہوگا۔ آیۂ بِر میں یہ بحث ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ﴾

خدمتِ خلق کی بلند ترین سطح

لیکن غور کیجئے گا۔ خدمت خلق ہی کی ایک بلند تر سطح اور بھی ہے‘ وہ بلند تر سطح ہے بھٹکے ہوؤں کو راہ راست پر لانا‘ وہ کہ جن کی زندگی کا رخ غلط ہو گیا ہے‘ جو ہلاکت اور بربادی کی طرف بگٹٹ دوڑے جا رہے ہیں‘ جو اپنی بے بصیرتی کے باعث آگ کے الاؤ میں کودا چاہتے ہیں‘ ان کو سیدھی راہ پر لانا‘ خلقِ خدا کو راہ ہدایت کی طرف دعوت دینا‘ اس سے بڑا خدمتِ خلق کا معاملہ اور کوئی نہیں! اس لئے کہ موٹی سی بات ہے کہ اگر کسی کو غذا فراہم کر کے اس کے پیٹ میں لگی ہوئی بھوک کی آگ کو آپ نے بجھا بھی دیا تو کیا ہوا‘ اگر وہ ہمہ تن آگ کے حوالے ہونے والا ہو اور آپ کو اس کی فکر نہ ہو! یہ کوئی ایسا بڑا خدمت خلق کا کام تو نہ ہوا۔ اگر کسی کی کوئی وقتی سی دنیاوی ضرورت آپ نے پوری کر بھی دی درآنحالیکہ آپ کو یقین ہے‘ اگر واقعتاً آپ کی آنکھیں کھل چکی ہیں کہ وہ جس ڈگر پر چل رہا ہے اس کا انجام ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں تو آپ نے اس کے ساتھ کیا بھلائی کی! جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال ایسے ہے کہ جیسے آگ کا ایک بڑا الاؤ ہے جس میں تم گر پڑنا چاہتے ہو اور میں تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر اور تمہارے کپڑے گھسیٹ گھسیٹ کر تمہیں اس سے روکنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہی مضمون سورۃ التحریم میں بھی وارد ہوا تھا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا﴾ ”اے اہلِ ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے!“ اور حضور ﷺ کا وہ طرزِ عمل کہ ((یَا فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ اَنْقِذِیْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ)) ”اے محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ! اپنے آپ کو آگ سے بچا لے“۔ اور ((یَا صَفِیَّةُ عَمَّةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ اَنْقِذِیْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ)) ”اے اللہ کے رسول (ﷺ) کی پھوپھی صفیہ! اپنے آپ کو آگ سے بچا

© rasailojaraid.com

لے" کہ آپؐ اپنے گھر کے ایک ایک فرد کو گویا جہنم کی آگ سے خبردار فرماتے تھے اور اس سے خود کو بچانے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ یہ خدمتِ خلق کی بلند ترین منزل ہے۔

نبی اکرم ﷺ پر جب تک وحی کا آغاز نہیں ہوا تھا آپؐ کی حیاتِ طیّبہ میں خدمتِ خلق کی وہ ابتدائی منزل بتمام و کمال موجود تھی۔ یتیموں کی خبر گیری ہے' مسکینوں کی خدمت ہے' مسافروں کی مہمان نوازی ہے۔ یہ تمام چیزیں اپنی اعلیٰ ترین شکل میں حضور ﷺ کی سیرت میں موجود تھیں۔ لیکن پھر جب آپؐ کے پاس وہ "الحق" آ گیا' ہدایتِ خداوندی نازل ہو گئی' جب آپؐ پر حقائق منکشف کر دیئے گئے' جب عالمِ آخرت کے اسرار آپؐ کی نگاہوں پر روشن کر دیئے گئے' آپؐ کی ساری مساعی' ساری تگ و دو' ساری دوڑ دھوپ اور خدمتِ خلق کا وہ پورا جذبہ مرتکز ہو گیا اس پر کہ خلقِ خدا کو خدا کی بندگی کی دعوت دیں' راہِ ہدایت کی طرف بلائیں' نیند کے ماتوں کو جگائیں' جو لوگ مدہوش ہیں اور ہلاکت و بربادی کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں ان کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کریں۔ یہ چار باتیں جو درحقیقت منبر کی تین سیڑھیوں کے مشابہ ہیں' بیان کرنے کے بعد فرمایا: ﴿ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ تاکہ تم فلاح پاؤ۔ "لَعَلَّ" کے اصل معنی ہوتے ہیں "شاید" ـــــ ترجمہ یوں ہو گا "شاید کہ تم فلاح پاؤ" اور یہ "شاید" کا لفظ جب شاہانہ انداز میں کلامِ الٰہی میں آتا ہے تو اس میں حتمیت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے' جیسے کوئی بادشاہ اگر کسی سے کہے کہ اگر تم یہ کرو تو شاید ہم تمہارے ساتھ یہ معاملہ کریں' تو درحقیقت یہاں یہ "شاید" ایک مکمل وعدے کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ تو فرمایا "لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" یہ سب کچھ کرو گے تو فلاح سے ہم کنار ہو گے۔ یہ کرو گے تو کامیابی حاصل کر سکو گے۔

"اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں!"

معلوم ہوا کہ اب ہم پھر اسی مقام پر پہنچ گئے جہاں سے کہ ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس آیۂ مبارکہ میں گویا سورۃ العصر اپنے جملہ مضامین کے ساتھ پھر ہمارے سامنے آ گئی۔ اس لئے کہ وہاں نجات کی شرطِ اوّل تھی ایمان' یہاں خطاب ہوا ہے ﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ

© rasailojaraid.com

اٰمَنُوْا ﴾ ”اے اہلِ ایمان!“ کے الفاظ سے۔ وہاں ایمان کے فوراً بعد ﴿ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ کی شرط مذکور تھی۔ یہاں اسی عملِ صالح نے ﴿ ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ ﴾ کے الفاظ میں چار اوامر کی شکل اختیار کرلی۔ ”رکوع کرو‘ سجدہ کرو‘ بندگی کرو اپنے رب کی اور تمہارا عمل خیر پر مبنی ہو جائے“۔ البتہ ”وَافْعَلُوا الْخَيْرَ“ کو اس کے وسیع تر مفہوم میں لیجیے جیسے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ)) کہ لوگوں میں بہتر وہی ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچا رہا ہو‘ جس سے لوگوں کو نفع پہنچ رہا ہو۔ اب ظاہر بات ہے کہ نفع صرف دنیا کا نفع ہی تو نہیں ہے۔ یہ نفع کا نہایت محدود تصور ہے۔ اور اگر فی الواقع آنکھیں کھل گئی ہوں‘ حقیقت منکشف ہوگئی ہو‘ آخرت کا علم انسان کو حاصل ہوگیا ہو‘ تو اب ”نفع“ کا مفہوم بدل جائے گا۔ اب انسان کو نظر آئے گا کہ اصل نفع تو آخرت کا نفع ہے۔ اصل جیت وہاں کی جیت اور اصل ہار وہاں کی ہار ہے۔ سورۃ التغابن میں ہم پڑھ چکے : ﴿ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ﴾ ”وہ ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا دن“۔ جو اُس روز نفع میں رہا وہ حقیقتاً نفع میں رہا اور جو اُس روز گھاٹے میں قرار دیا گیا وہی ہے اصل میں گھاٹا پانے والا!

فلاح کا دارومدار دینی فرائض کی ادائیگی پر ہے!

اس آیۂ مبارکہ پر پھر اپنی توجہ کو مرکوز کیجیے! ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ ﴾ ”اے اہلِ ایمان! رکوع کرو‘ سجدہ کرو‘ اپنے رب کی بندگی کرو (اُس کی اطاعت کُلی پر کاربند ہو جاؤ‘ اس کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر) اور بھلے کام کرو‘ (نیکیاں کرو‘ خلقِ خدا کی خدمت کرو) یہ سب کام کرو گے تو فلاح پاؤ گے! آپ غور کیجیے کہ اگر صرف دعوائے ایمان سے فلاح اور کامیابی کا حصول یقینی ہو جائے تو کیا یہ سارا کلام ‘نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ مہمل نہیں قرار پائے گا؟ یہ بے معنی بات ہوگی۔ یہ منطق کی اصطلاح میں تحصیل حاصل قرار پائے گا۔ جو چیز محض دعوائے ایمان سے یا مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو جانے سے خود بخود حاصل ہو جائے اس کے لئے اتنا کھکھیڑ مول لینا‘ اتنی محنت اور مشقت کرنا سعیٔ لاحاصل قرار پائے

© rasailojaraid.c

گا۔ پھر یہ رکوع و سجود' بندگیٔ رب' پوری زندگی میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعتِ کُلّی اور خدمتِ خلق پر کمربستہ ہو جانا گویا یہ سب اضافی چیز قرار پائیں گے! لیکن قرآن حکیم اس غلط فہمی کو دور کر دینا چاہتا ہے۔ جیسے کہ سورۃ العصر میں یہ بات وضاحت سے سامنے آئی تھی کہ نجات کی شرائط چار ہیں! ﴿ وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ○ ﴾

چوتھا تقاضا: جہاد فی سبیل اللہ

ایمان اور عمل صالح کی حد تک بحث تو سورۃ الحج کی اس ایک آیت میں مکمل ہو گئی جس کا مطالعہ ہم نے ابھی کیا ہے۔ اور تواصی بالحق اور تواصی بالصّبر کے قائم مقام کے طور پر' جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ کے حوالے سے اب اصطلاح آ رہی ہے یعنی جہاد۔ اور پھر دوسری آیت جو اس رکوع کی آخری آیت ہے' پوری کی پوری جہاد ہی کے موضوع پر ہے۔ فرمایا: ﴿ وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾ "اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ جہاد کا حق ہے"۔ آپ دیکھیں گے کہ اس رکوع کے پہلے اور دوسرے حصّے کے مابین مضامین کے اعتبار سے بڑا گہرا ربط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ترتیبِ مضامین کے اعتبار سے ہمارے اس منتخب نصاب میں اب جہاد ہی کا مضمون چل رہا تھا لیکن اس آخری آیت کے مفہوم کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس پورے رکوع کا مضمون سامنے آ جائے۔

رکوع کے دونوں حصّوں کا تقابل کیجئے! اوپر لفظ آیا تھا ﴿ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ﴾ کہ انہوں نے خدا کو نہ پہچانا جیسے کہ پہچاننا چاہیئے تھا۔ وہ اللہ کے مقام و مرتبہ اور اُس کی صفاتِ جمال و کمال کا کوئی اندازہ نہ کر پائے جیسا کہ اس کے اندازے کا حق تھا۔ وہی اسلوب یہاں آ رہا ہے: ﴿ وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾۔ یہ دو چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: (۱) خدا کی معرفت جیسا کہ اس کا حق ہے' اور (۲) خدا کے لئے جہاد' کوشش' جدّ و جُہد اور محنت جیسا کہ اس کا حق ہے۔ پہلی چیز ایمان کا لُبِّ لباب اور ایمان کا اصل حاصل ہے۔ انسان کی نظری و فکری و عملی قوّتوں کی معراج ہے اللہ کی معرفت!

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

اور انسان کے قوائے عملیہ کا جو بہترین ہدف اور ان کا بہترین مصرف ہے وہ ہے جہاد فی اللہ' یعنی اللہ کے لئے جہاد۔ در حقیقت "فی اللہ" سے مراد بھی کم و بیش وہی ہے جو "فی سبیل اللہ" سے ہے' جس پر مفصّل گفتگو پچھلے سبق میں ہو چکی ہے۔ آیت کے الفاظ پر توجّہ کو جمایئے! ﴿ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾ اور محنتیں کرو' کوششیں کرو' جدّ و جُہد کرو' لگاؤ اس راہ میں اپنی جانیں اور اپنے مال اور کھپاؤ اپنی جسمانی قوتیں اور صلاحیتیں اور صرف کرو اپنے اوقات اس طور سے اور اس شان سے کہ جس شان سے اللہ کے لئے محنت کرنے کا حق ہے۔

یہاں ذہن میں رکھئے کہ انسان محنتیں کرتا ہے' مشقتیں بھی کرتا ہے' لیکن یہ مسئلہ کہ اس کی محنت اور مشقت پر کس کا کتنا حق ہے' اس کی صحیح تعیین ہی پر دار و مدار ہے اس کے صحیح یا غلط ہونے کا۔ ہم میں سے اکثر لوگ وہ ہیں جو اپنے آپ کو گویا کہ ہمہ تن کھپا دیتے (invest کر دیتے) ہیں اپنی اولاد پر۔ بلکہ ہم میں سے اکثر و بیشتر کے معاملے میں یہ بات شاید غلط نہ ہو گی جو ایک صاحب نے بڑے عجیب پیرائے میں ایک زمانے میں مجھ سے کہی تھی کہ میں تو اپنی بیوی بچوں کا ملازم ہوں کپڑے اور روٹی پر! میری ساری محنت صرف ہوتی ہے کمانے پر۔ اور اس کمائی کا مصرف کیا ہے؟ میرے یہ گھر والے' ان کی ضروریات' ان کا پیٹ پالنا' ان کا تن ڈھانپنا اور بس! یہ انتہائی تلخ حقیقت ہے کہ اگر تجزیہ کیا جائے تو ہمارے ننانوے فیصد لوگوں کی سعی و جہد' ان کی بھاگ دوڑ' ان کی محنت کا اصل حاصل اس کے سوا کچھ نہیں! سوال یہ ہے کہ انسان اگر اپنے اہل و عیال کے لئے محنتیں اور مشقتیں کر رہا ہے تو وہ اہل و عیال آخر اس کو کیا repay کر سکیں گے؟ اس کی اس محنت اور جدّ و جُہد کی کیا قیمت ادا کر سکیں گے؟ اسے اس کا کیا بدلہ دے سکیں گے؟ اکثر و بیشتر تو وہی اولاد انسان کے بڑھاپے کے وقت اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہوتی ہے۔ یہ الفاظ بھی زبان سے نکلتے ہیں کہ ابا جان! آپ پرانے زمانے کے لوگ ہیں' آپ کو کیا معلوم کہ جدید زمانے کے تقاضے کیا ہیں! اس وقت جس طرح کلیجہ اندر سے کٹتا ہے کہ یہ ہیں وہ کہ جن پر ہم نے اپنے آپ کو نچھاور کر دیا تھا' لگا دیا تھا اور کھپا دیا تھا! چنانچہ فرمایا: ﴿ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾ تم سوچو کہ تمہاری محنت و مشقت اور تمہاری

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

سعی و جہد کا اصل حق دار کون ہے؟ کیا وہی نہیں جو تمہارا خالق ہے، تمہارا مالک ہے، تمہارا پروردگار ہے، تمہارا پالنہار ہے اور تمہارا رازق ہے! اگر واقعتاً تم نے اسے پہچان لیا ہے، اگر یہ تمہارا اقرار لسانی محض ایک عقیدہ نہیں ہے جو زبان پر ہو، بلکہ اس کی حقیقت بھی کسی درجے میں تمہیں حاصل ہو چکی ہے اور تمہارے دل و دماغ اس حقیقت سے منور ہو چکے ہیں تو اس کا تو پھر ایک ہی نتیجہ نکلنا چاہئے، وہ یہ کہ تمہاری سعی و جُہد کا اوّلین ہدف اور تمہاری قوتوں اور توانائیوں کا اوّلین مصرف اللہ اور اس کے دین کی سربلندی قرار پانا چاہئے۔ اور تمہاری قوتوں اور صلاحیتوں کا بہتر اور بیشتر حصہ لگنا چاہئے اور کھپنا چاہئے اللہ کے لئے! اسی کا نام ہے جہاد فی اللہ یا جہاد فی سبیل اللہ! اس طور سے جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے۔ یہ نہ ہو کہ معمولی سی کوشش یا تھوڑی سی محنت کر [illegible] تھوڑا سا وقت لگا دیا، کچھ تھوڑا سا کہیں چندہ دے کر انسان اپنے دل کو مطمئن کر بیٹھے کہ میں نے حق ادا کر دیا، میں نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی، اللہ کے لئے جتنا کچھ مجھے کرنا چاہئے تھا وہ میں نے کر دیا! یہاں "حَقَّ جِهَادِهٖ" کے الفاظ بہت اہم ہیں اور ان کے ذریعے اس عمل کو جس شدّ و مد کے ساتھ اور جس وسعت کے ساتھ ہونا چاہئے اور زندگی میں اس کو جس درجے اہمیت، جو مقام اور مرتبہ ملنا چاہئے، اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ ابھی یہ مضمون جاری رہے گا ___ جہاد فی سبیل اللہ کا ہدفِ اوّلین یعنی شہادت علی النّاس درحقیقت اس آخری آیت کا اصل مضمون ہے، جس کے پیش نظر اس مقام کو منتخب نصاب کے اس حصّے میں شامل کیا گیا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین!

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک نہایت مؤثر اور جامع خطاب

مثیلِ عیسیٰؑ --- علیؓ مرتضیٰؓ

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن

© rasailojaraid.